# پاکستان میں مشرقی تنقید: امتیازات اور اعتراضات

ڈاکٹر اورنگزیب نیازی☆

**Abstract**

Oriental criticism derives its principles directly from Arabic and Persian criticism. Its initial signs are found in "Tazkara" of Urdu poets.Oriental criticism played an important role in evolution of Urdu criticism but it remained unaware of modern theories,trends and ideas of criticism.It did not accept the role of other subjects and social sciences like psychology, socialogy, anthropology and linguistics.This article throws light on the salient features, characteristics, ditinctions and also demerits of oriental criticism generally in Urdu and especially in Pakistani literatores.

اردو تنقید کے ابتدائی اور مدھم نقوش شعرا کے ان تذکروں میں تلاش کیے جا سکتے ہیں جو فارسی زبان میں لکھے گئے۔ یہ بات دلچسپ بھی ہے اور حیران کن بھی کہ اردو شعریات پر محاکمہ فارسی زبان میں کیا گیا۔ شاید یہ ایک سماجی ضرورت تھی کیوں کہ فارسی کو اس وقت سرکاری زبان کا درجہ حاصل تھا۔ تذکروں میں تنقید کے لیے چند مخصوص الفاظ اور اصطلاحات کا سہارا لیا گیا۔ اس لیے اردو تنقید کی نہ تو کوئی زبان متشکل ہو سکی نہ کوئی فکری جہت متعین ہوئی۔ بیسویں صدی کے آغاز تک مانگے تانگے کے مغربی خیالات کے سہارے اردو تنقید کا سفر جاری رہا۔ ہمارے بزرگ ناقدین انگریزی خیالات سے جزوی واقفیت تو رکھتے تھے لیکن وہ کوئی مربوط تنقیدی نظام فکر مرتب نہ کر سکے۔ حالی اور آزاد نے انجمن

---

☆ لیکچرار شعبہ اردو، گورنمنٹ اسلامیہ کالج سول لائنز، لاہور

پنجاب کے پلیٹ فارم سے عقلی اور اجتماعی بنیادوں پر زبان کی تبدیلی اور انگریزی خیالات کی ترجمانی کی کوشش ضرور کی لیکن ان کے مقاصد اور تھے۔اس لیے ان کی یہ کوششیں بھی اردو تنقید کے لیے کسی بڑی تبدیلی کا پیش خیمہ نہ بن سکیں۔ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے آغاز کے ساتھ ایک نئی تنقیدی فکر نے جنم لیا اور مغرب کے تنقیدی خیالات سے اثر پذیری کا عمل تیز ہو گیا۔چناں چہ قیامِ پاکستان کے وقت اُردو کو جو تنقیدی روایت ورثے میں ملی وہ مغربی تنقید کے اثرات کو کامیابی سے قبول کرتی ہوئی جدیدیت کے راستے پر گامزن تھی۔ترقی پسند تحریک اور حلقہ اربابِ ذوق کے دو مختلف رجحانات کے زیر اثر تنقید کے نئے زاویے جنم لے رہے تھے اور فکر و نظر میں توسیع اور ارتقا کا عمل برابر جاری تھا۔دوسری طرف ناقدین کا ایک طبقہ وہ بھی تھا جو اپنی ادبی روایت سے پوری طرح منسلک تھا۔یوں ہمارے اُس قدیم اندازِ نقد کا سفر بھی جاری رہا جسے ہم مشرقی تنقید کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور جسے بعد ازاں ہمارے ہاں روایتی، درسی، مکتبی اور تشریحی و توضیحی تنقید کا نام بھی دیا گیا۔مراد وہ اندازِ نقد ہے جو خالصتاً ہماری مشرقی روایت کا حصہ رہا ہے یعنی فن پارے کی جانچ پرکھ کے وہ اصول اور قاعدے جو عربی سے فارسی اور فارسی سے اُردو میں رائج ہوئے۔اس نظامِ تنقید کے مطالعاتی منہاج اور اس کے حدود و امتیازات کا تعین کرتے ہوئے عابد علی عابد لکھتے ہیں:

> ''عربی، فارسی اور اُردو میں قدیم اسلوب انتقاد کے مطابق ادبیات کو جانچنے اور پرکھنے کا دارومدار اصلاً تین علوم پر ہے۔یعنی معانی، بیان اور بدیع۔بعض نقاد عروض اور علم القوافی کے مطالعہ کو بھی لازمی قرار دیتے ہیں۔راقم السطور کی رائے میں اہم ترین مسائل کا تعلق تو پہلے تین علوم ہی سے ہے البتہ عروض اور علم القوافی کا باقاعدہ اور منظم مطالعہ فائدہ سے خالی نہیں کہ انتقادِ شعر میں ان دونوں علوم سے بہرحال مدد لینا ہی پڑے گی۔نقاد کے لیے یہ ضروری نہیں کہ وہ عروض اور علم القوافی میں متخصص کی حیثیت رکھتا ہو لیکن اس میں اس کی واقفیت لازم ہے معانی، بیان اور بدیع کا معاملہ دوسرا ہے۔جب تک نقاد کو ان تینوں پر پورا عبور

نہ ہوگا قدیم اسلوب انتقاد کے مطابق وہ ادبی تخلیقات کی قدر و قیمت کبھی متعین نہ
کر سکے گا۔(۱)

مشرقی تنقید کا اہم مآخذ عربی تنقید کی روایت ہے۔جس میں یونانی فکر کے وہ آثار بھی نظر آتے ہیں جو یونانی ادب عالیہ کے براہِ راست تراجم بالخصوص ارسطو کی بوطیقا اور ریطوریقا کے تراجم کے ذریعے مشرقی ادب تک پہنچے۔ارسطو نے فنِ بلاغت پر اپنے رسالے میں فن پارے کی ہیئت پر زیادہ توجہ دی اور تخلیقی فن پارے کو ایک ایسی مربوط وحدت قرار دیا جس کے اجزائے ترکیبی میں ایک خاص آہنگ اور باہمی توازن کا ہونا ضروری ہے۔یونانی تنقید کا اثر جہاں جہاں پھیلا وہاں ارسطو کی بوطیقا کے زیر اثر ہیئت پرستی کا ایک خاص رجحان پیدا ہوا اور فن پارے کی جانچ پرکھ فصاحت و بلاغت کے معیارات پر ہونے لگی۔یونانی تصورات کے زیر اثر قبل مسیح کے رومن ادب میں بھی تنقیدِ شعر کے لیے علم بیان اور قواعدِ زبان کے پیمانے استعمال ہونے لگے اور ادب و شعر کی تخلیق میں زبان کا موثر استعمال، الفاظ کی نشست و برخاست اور فن پارے کی ساخت اہم موضوعات قرار پائے۔رومن ادب کے اثرات تو عربی تک پہنچے یا نہیں لیکن یونانی ادب کے جو اثرات براہِ راست عربی کی تنقیدی روایت پر مرتب ہوئے انھوں نے جزوی طور پر عربی کی تنقیدی روایت کو ضرور متاثر کیا۔جزوی اس لیے کہ شاعری کی جانچ پرکھ کے جو اصول عربوں میں رائج تھے ان کا پس منظر عربوں کی اپنی شعری روایت تھی۔(۲) عہدِ عباسی تک عربی کی ادبی روایت میں تنقید ایک مستقل فن کی صورت میں نظر نہیں آتی۔ اس دور میں جب دیگر علوم وفنون کی تدوین ہوئی تو تنقید بھی فنی نکتہ نظر سے موضوع بحث بنی اور اس کے مستقل اصول مرتب ہوئے۔ابن جعفر قدامہ کی کتاب ''نقد الشعر''، ابن رشیق کی ''العمدہ''، جاحظ کی ''البیان والتبیین''، ابو الفرج اصفہانی کی ''کتاب الاغانی'' اور دیگر کتابوں میں ادب و شعر کے تنقیدی اصولوں پر بحث کی گئی۔فارسی تنقید دراصل عربی تنقید ہی کا تسلسل ہے کیوں کہ فارسی میں شاعری کی جانچ پرکھ کے لیے جو اصول متعین کیے گئے وہ عربی تنقید کی اسی روایت سے اخذ کیے گئے۔چناں چہ فارسی میں بھی ابتدائی طور پر جو مسائل زیر بحث لائے گئے ان کا تعلق بھی عربی کی طرح علم معانی، بدیع، بیان سے

تھا۔ عہدعباسی سے پہلے فارسی میں تنقیدی آثار نظر نہیں آتے' فارسی میں ابتدائی تنقید کے آثار'' قابوس نامہ''، ''چہار مقالہ لباب الالباب''، ''المعجم فی معائر اشعار العجم ''میں ملتے ہیں۔ یہ تمام کتابیں عباسی عہد کی عربی تنقید کے زیر اثر لکھی گئیں۔عربی اثرات کے باوجود فارسی تنقید نے اپنی ایک خودمختار حیثیت قائم کی۔اردو میں ابتدائی تنقید نے عربی اور فارسی کی اسی تنقیدی روایت سے اثر قبول کیا بل کہ اُردو میں تنقید کا آغاز بھی انھی روایات کے زیر اثر ہوتا ہے اور ابتدا میں جو تنقیدی روایت پروان چڑھتی ہے وہ عربی اور فارسی تنقید کے دائروں سے باہر کہیں قدم نکالتی نظر نہیں آتی۔ابتدائی اُردو تنقید کے بنیادی عناصر وہی ہیں جو عربی اور فارسی تنقید کا خاصا ہیں۔

تقسیم کے وقت ہماری اُردو تنقید کا غالب رجحان مشرقیت کی طرف نظر آتا ہے۔ کہنے کو تو انیسویں صدی کے ربع آخر میں ہی اُردو تنقید نے مغربی اثرات کو قبول کرنا شروع کر دیا تھا اور قیام پاکستان تک ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے زیر اثر مغربی تنقیدی افکار ہماری اُردو کی تنقیدی روایت میں سرایت کر رہے تھے لیکن مشرقی انداز نقد پر مغربی اثرات بالائی سطح پر ہی رہے۔ ہمارے مشرقی نقادوں نے بالوسطہ یا بلاواسطہ طور پر مغربی نظریات کا مطالعہ تو ضرور کیا اور کسی حد تک وہ ان سے متاثر بھی تھے مگر ان کے ہاں یہ اثرات پوری گہرائی تک نہیں اترے تھے۔ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق سے قطع نظر اس وقت ہماری تنقیدی روایت میں جو بڑے اور معتبر نام نظر آتے ہیں ان میں سے بیش تر کا تعلق مشرقی انداز نقد سے ہی ہے۔لہٰذا ان کا بیش تر تنقیدی سرمایہ مشرقی تنقید کا ہی حصہ قرار پاتا ہے۔ اس کی بڑی وجہ شاید یہ ہے کہ اس وقت کے زیادہ تر لکھنے والوں کا تعلق اس نسل سے ہے جو بیسویں صدی کے آغاز سے تنقید سے وابستہ تھی اور قیام پاکستان کے بعد انھوں نے اپنا تنقیدی سفر اسی سمت میں جاری رکھا۔اس حوالے سے تقسیم کے بعد پاکستان میں ہمیں مشرقی تنقید سے وابستہ دو طرح کے نقاد نظر آتے ہیں۔

**اول:** وہ نقاد جن کا تعلق سرزمین پاکستان سے ہے اور جنھوں نے تقسیم کے بعد پاکستان میں اپنا نقد و ادب کا سلسلہ جاری رکھا۔

**دوم:** وہ نقاد جو تقسیم کے بعد ہجرت کر کے پاکستان آئے اور اب ان کا تنقیدی سرمایہ پاکستان میں تخلیق ہونے والے ادبی سرمایے کا حصہ ہے۔

مشرقی تنقید سے وابستہ ناقدین کے تنقیدی سرمایے کا مطالعہ اس نظام تنقید کی مبادیات کو واضح کرتا ہے۔ یہ نظام تنقید جن عناصر سے تشکیل پاتا ہے اور اس کی جو نمایاں جہات متعین ہوتی ہیں۔ ان کو اس طرح سے بیان کیا جا سکتا ہے:

الف۔ فن پارے کی توضیح و تشریح

ب۔ علم معانی، بدیع و بیان، عروض اور قوافی کے پیمانوں پر فن پارے کی جانچ پرکھ اور اسلوب کا جائزہ

ج۔ کلاسیکی ادب کا تحقیقی جائزہ

د۔ تقابل و موازنہ

ر۔ غالب و اقبال کے افکار کی توسیع اور تشریح

ناقدین ادب نے تنقید کو جن اقسام میں تقسیم کیا ہے ان میں سے تشریحی تنقید، مکتبی تنقید، ہیئتی تنقید (مختلف معنوں میں) ادغانی تنقید، تقابلی تنقید، تاثراتی تنقید (کسی حد تک) مشرقی تنقید کے دائرہ کار میں آتی ہیں۔ ہیئتی، تقابلی اور تاثراتی تنقید کے تصورات میں بعد ازاں جو تبدیلیاں رونما ہوئیں مشرقی تنقید ان سے بے نیاز ہے۔ مشرقی اندازِ نقد کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا اور اسے مدرسانہ، مکتبی، منشیانہ اور پروفیسرانہ تنقید جیسے نام دے کر اس کی تضحیک کی گئی۔ معترضین کا خیال ہے کہ مشرقی تنقید نے قدامت پرستی کا ثبوت دیا اور قدیم اندازِ نقد سے چمٹی رہی۔ حالاں کہ زمانہ کئی چالیں بدل چکا تھا۔ اور تنقیدی تصورات میں کئی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔ خصوصاً مغربی تنقید کے اثرات کو قبول نہ کر کے گویا ہمارے مشرقی نقاد بہت بڑے جرم کے مرتکب ہوئے ہیں، ان کے ہاں خیال و نظر کی وسعت معدوم اور تنقیدی شعور سرے سے موجود ہی نہیں۔ لہٰذا اس جرم کی پاداش میں انھیں اُردو کی تنقیدی روایت سے خارج کر دیا جائے۔ اسلوب احمد انصاری فیصلہ صادر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''حالی اور شبلی کے علاوہ پرانی تنقید کے ایسے نمایندہ لکھنے والے جیسے امداد امام اثر''

وحید الدین سلیم، مولوی عبدالحق، عبدالسلام ندوی، عابد علی عابد، ڈاکٹر سید عبداللہ، نیاز فتح پوری، مسعود حسن رضوی، اور حامد حسن قادری (اگر ان سب کو نقاد کہا جائے جو بہت مشتبہ ہے) کے ہاں خیال اور نظر کی وسعت معدوم اور تنقید کا کوئی شعور موجود نہیں۔ ان کے ہاں اُنھی پرانے تصورات کی تکرار ملتی ہے جو عربی اور فارسی روایت سے ماخوذ ہیں۔ یعنی شعر و ادب کا مصلحانہ رول، الفاظ و تراکیب کی قدرت پر زور، ایک ہی موضوع پر دو شاعروں کی طبع آزمائی کو تقابل کا معیار بنانا، برجستگی، سلاست اور روانی کا بار بار ذکر اور پیرایۂ بیان کی جدت پر اصرار''۔(۳)

معترضین کا یہ اعتراض بجا ہے کہ مشرقی تنقید نے تنقید کے بدلتے ہوئے تناظر سے آنکھیں چرائیں اور تنقیدی روایت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں اور مغربی تنقید کے اثرات کو قبول کرنے سے گریز کیا۔ اگر ہم صرف اپنے موضوع ''پاکستان میں مشرقی تنقید'' تک محدود رہیں تو اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس زمانے تک جدید تنقیدی تصورات تک رسائی بہت آسان ہو چکی تھی۔ اس دور کے ہمارے بیش تر نقاد انگریزی ادبیات سے واقف تھے اور اُنھوں نے نظری سطح پر مغربی افکار کو موضوع بحث بھی بنایا مگر ان کی بحث مغربی تنقید کے ارتقا اور اثرات کے بیان سے آگے نہیں بڑھی۔ اس دور کے ہمارے بزرگ نقاد اپنی رائے کو صائب بنانے کے لیے مغربی نقادوں کی آرا اور حوالہ ضرور دیتے ہیں مگر ان اصولوں پر اپنی تنقید کی بنیادیں استوار کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

مشرقی تنقید نے بین العلومی مطالعات کی افادیت سے انکار کیا اور عمرانیات، اقتصادیات، بشریات اور نفسیات، سماجیات، لسانیات جیسے علوم سے استفادے اور نئے تصورات اور تحریکات کے مطالعے سے اپنی فکری جہت میں تبدیلی کی کوشش نہیں کی بل کہ مطالعہ ادب کے لیے وضع کیے گئے قدیم پیمانے ہی استعمال کرتی رہی۔ اس لیے ڈاکٹر سلیم اختر کا اس تنقید کو ''نا وابستہ تنقید'' کا نام دینا بھی درست معلوم ہوتا ہے۔(۴) قیام پاکستان تک ادبیات میں نفسیات کے اثرات جس طرح عام ہو چکے تھے ان کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا مگر ہماری مشرقی تنقید ادب میں نفسیات کے اثرات کو قبول کرنے سے

بدکتی رہی۔ ۱۹۶۷ء میں شایع ہونے والی سید عبداللہ کی کتاب ''اُردو ادب ۱۸۵۷ء تا ۱۹۶۶ء'' کے دیباچے میں جب ڈاکٹر وحید قریشی نے ان کی تنقید پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا کہ وہ نفسیات کی افادیت کے منکر ہیں (۵) تو اس کے جواب میں سید عبداللہ کا استدلال تھا:

> ''نفسِ انسانی کی گہرائیوں تک پہنچنا اور صحیح نتائج برآمد کرنا میری رائے میں ابھی ممکن نہیں ہوا۔ اس قیاسی اساس کی وجہ سے رُوس میں تحلیل نفسی کو بے بنیاد اور غیر یقینی عمل قرار دیا گیا ہے۔ میں کرامت اور ولایت کو مان سکتا ہوں مگر تحلیل نفسی کو مکمل علم نہیں مان سکتا''۔(۶)

مشرقی تنقید کا یہی رویّہ اسے قدامت پرستی کی طرف دھکیلتا ہے۔ نفسیات کے اثرات کو قبول نہ کرنے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں عام طور پر نفسیات کے علم کو فرائڈ کے نظریات کی بدولت محض ایک جنسی علم سمجھا گیا۔ نتیجتاً ہمارے مشرقی بزرگ اس سے احتراز برتتے رہے۔ ادب میں نفسیات، عمرانیات، اقتصادیات اور اس طرح کے دوسرے علوم سے استفادہ ایک سائنسی طریقِ کار کا متقاضی ہے جب کہ ہمارے ہاں نقادوں کی ذہنی تربیت جس ماحول اور تنقیدی روایت میں ہوئی وہ مشرقی اقدار کی حامل تھی۔ جس میں سائنسی طریقِ کار کا دور دور تک کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ اُردو میں تنقیدی روایت کا آغاز تذکروں سے ہوتا ہے جو خالص مشرقی چیز ہیں۔ تذکروں میں تنقید کے اصول قدیم فن پاروں سے اخذ کیے گئے ہیں اور فنی سطح پر قدیم معیاری فن پاروں سے تقابل کے ذریعے تنقیدی معیارات وضع کیے گئے۔ انھیں مغربی تنقید کے اصولوں کی روشنی میں نہیں سمجھا جا سکتا۔ مغربی تنقید کی بنیاد تجزیاتی فکر و احساس پر ہے جب کہ مشرقی تنقید نے ترکیبی طرز سے جنم لیا ہے اور ترکیبی طرز میں تجزیہ و تحلیل اس طرح سے ممکن نہیں جس طرح مغربی تنقیدی طرز میں ہے لہٰذا مشرقی تنقید مغربی علوم کی روشنی میں فن پارے کے تجزیہ و تحلیل سے بھی قاصر رہی۔ اس طرزِ احساس نے جس مشرقی تنقیدی روایت کو جنم دیا اس میں جدید علوم سے استفادہ کی صورتیں بہت کم پیدا ہوتی ہیں۔ اس لیے اس روایت سے وابستہ نقاد اپنی تنقید کے لیے مشرقی پیمانے استعمال کرتے رہے ہیں۔ چوں کہ مشرقی تنقید کا غالب حصہ کلاسیکی

ادب کی تحقیق وتجزیہ پر مشتمل ہے اس لیے پیمانے بھی وہی استعمال کیے گئے جو مشرقی تنقید کا حصہ ہیں۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ مشرقی ادب کو مغربی تنقید کے اصولوں پر پرکھا نہیں جا سکتا' یقیناً پرکھا جا سکتا ہے لیکن ہر زبان اور ادب کا ایک مخصوص مزاج اور لسانی کردار بھی ہوتا ہے جو ہر حال میں توجہ کا طالب رہتا ہے اگر اس سے گریز کیا جائے گا تو تنقید کے گم راہ ہونے کا احتمال بھی رہے گا۔ مشرقی اندازِ نقد پر ہونے والی تنقیص نے جس رویّے کو جنم دیا وہ ہمارے ادب کے لیے کچھ زیادہ سود مند ثابت نہ ہوا۔ اس کا نتیجہ اپنے فکری ماضی سے انحراف اور مغائرت کے رجحان کی صورت میں سامنے آیا۔ اس صورت حال کا تجزیہ کرتے ہوئے جیلانی کامران کہتے ہیں:

> ''اگر اساتذہ کی رہنمائی میں کلاسیکی ادب کا تجزیہ کیا جائے تو معانی دستیاب نہیں ہوتے۔ صرف بحور اور عروضی مہارت سے آشنائی ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ بدلی ہوئی علمی دنیا میں عروضی مہارت اور بحور کی باتیں کوئی مقام نہیں رکھتیں ان واقعاتی شہادتوں کی روشنی میں ہمارے علوم کے لیے کوئی اور راستہ باقی نہیں رہ جاتا سوائے اس کے کہ وہ اپنی مدد کے لیے مغربی علوم اور مغربی تنقید کی طرف رُخ کریں مگر یہ رویہ بھی کوئی اچھا نتیجہ پیدا نہیں کرتا کیوں کہ مغربی علوم اور تنقید معانی کی تلاش میں مفید ثابت نہیں ہوتے اور ذہنی پریشانی کا باعث بنتے ہیں۔ ایسی نفسیاتی کیفیت میں اُردو' عربی اور فارسی کی تخلیقات بڑے ادب کی فہرست سے منہا ہو جاتی ہیں اور علم و ادب کے پرستار اپنے علوم کی قربانی دے کر اجنبی تہذیبی منطقوں کے علومِ ادبیات کی بالاتری کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔''(۷)

تشریح وتوضیح مشرقی تنقید کا بنیادی وظیفہ ہے۔ مشرقی تنقید کا جھکاؤ چوں کہ کلاسیکی ادب کی طرف ہے اس لیے قدیم اصناف کی تنقید میں زبان و بیان کے مباحث اور فن پاروں کی تشریح کو ہی مرکزی اہمیت حاصل رہی ہے۔ جس کی وجہ سے یہ اندازِ نقد حقیقی تنقید سے بہت دور ہو کر محض ایک بے

معنی فعل بن کر رہ گیا۔اس طرح نقاد کا کام صرف ان خیالات کی باز آفرینی ہے جن سے شاعر دوچار ہوا ہے۔ وہ شاعر کے خیالات اور اس کی کیفیات کو بغیر کسی تجزیہ و تحلیل کے اپنے لفظوں میں ادا کر دیتا ہے اور فن پارے کی قدر و قیمت کا تعین لفظیات، تشبیہات و استعارہ اور عروض قوافی کے پیمانوں پر کرتا ہے اس طرح سہل الفاظ میں فن پارے کا مفہوم تو واضح ہو جاتا ہے مگر تخلیقی سطح پر شعر فہمی میں ناکامی سے دو چار ہونا پڑتا ہے۔

اس رجحان کے فروغ میں یونیورسٹیوں اور کالجوں میں تنقید کی تدریس نے اہم کردار ادا کیا ہے۔اس لیے اسے مکتبی اور درسی تنقید کا نام بھی دیا گیا۔طلبہ کی نصابی ضروریات کو مدِ نظر رکھ کر لکھے گئے مضامین اور کتابوں میں موجود مواد بلکہ مختلف لوگوں کے بکھرے ہوئے خیالات کو یک جا کر دیا جاتا ہے اس وجہ سے اس طرزِ نقد کو انتخابی یا اوغانی تنقید بھی کہا گیا۔(۸) ہمارے تنقیدی سرمایے کا غالب حصہ اسی اندازِ نقد پر مشتمل ہے لیکن یہ تنقید کسی واضح تنقیدی رجحان یا خاص نکتہ نظر کی تشکیل نہیں کرتی۔بعض نقادوں کا خیال ہے کہ اس طرزِ تنقید نے ہمارے احساس و ادراک کو محدود اور نئی تنقیدی راہوں کو مسدود کر دیا ہے۔بہ قول ڈاکٹر جمیل جالبی:

> اس تنقید کا ایک زہریلا اثر تو یہ ہوا کہ آج کا طالب علم اور قاری کسی اور یجنل تصنیف کے بارے میں اپنا کوئی تجربہ نہیں رکھتا۔اسے ادب پاروں سے کوئی گہری دِل چسپی نہیں ہے بلکہ نصابی نقادوں کی رائیں ادب پاروں کا بدل بن گئی ہیں۔اس زہریلے اثر نے سوچنے کی صلاحیت کو مردہ کر دیا ہے اور ادب پاروں کے ساتھ ذہنی سفر کو ایک بے معنی چیز بنا دیا ہے۔نصابی نقادوں کی آرا کی بیساکھیاں نوجوانوں کے پاس ہیں اور ادبی فیصلوں کے کیپسول ان کے ذہن کے خانوں میں رکھے ہیں جن کے ذریعے وہ اپنی ساری ضروریات پوری کر لیتے ہیں۔''(۹)

درسی تنقید کسی بڑے تنقیدی شعور، تنقیدی اصول یا زاویہ نظر کی نمایندگی نہیں کرتی بلکہ محض

نصابی ضروریات کو پورا کرتی ہے ہماری مشرقی تنقید کے اس پہلو کو یونیورسٹیوں میں ایم۔اے، ایم۔فل اور پی۔ایچ ڈی کے لیے لکھے جانے والے مقالات نے بہت فروغ دیا ہے۔ ایک خاص فارمولے کے تحت ایک رسمی خاکہ تیار کیا جاتا ہے اور پھر اس میں مختلف طرح کی معلومات سے رنگ بھر کر مقالہ تیار کرلیا جاتا ہے جسے تنقیدی مقالے کا نام دیا جاتا ہے اس طرح کی تنقید میں عموماً خاص طرح کی معلومات کو یک جا کیا جاتا ہے اور نتائج کے استخراج کے لیے بھی دوسرے نقادوں کی آرا کا سہارا لیا جاتا ہے تاہم ان خیالات کا ایک فائدہ یہ ضرور ہوتا ہے کہ بنیادی نوعیت کی معلومات یک جا ہو جاتی ہیں اور آیندہ اس موضوع پر کام کرنے والوں کے لیے بہت سی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔

پاکستان میں مشرقی تنقید کے اس پہلو (توضیحی وتشریحی یا درسی) نے تنقید کو کوئی نیا انداز نہیں دیا مگر ادبی روایات کے احساس کو ضرور بڑھایا ہے۔ اس کی وجہ سے بہت سی معلومات اور ادبی نکتے فراہم ہوئے اور غور وفکر کا کچھ سامان پیدا ہوا' اس فضا اور ماحول نے تنقیدی تجربات کو آگے بڑھنے میں مدد ضرور دی ہے اگرچہ تشریحی تنقید کسی تنقیدی نظریے کو جنم نہیں دے سکی لیکن جس طرح سے تشریحی اور مکتبی تنقید کو اُردو کے تنقیدی سفر کے لیے زہر قاتل قرار دیا گیا ہے وہ بھی درست نہیں ہے۔

مشرقی نقادوں نے جدید ادب سے زیادہ اپنے کلاسیکی ادب کو موضوع تنقید بنایا ہے اور اس ذیل میں جو تنقیدی کام ہوا اس کا زیادہ حصہ قدیم شعری ونثری اصناف مثلاً داستان، مثنوی، غزل، قصیدہ کی تنقید پر مشتمل ہے۔ قدیم اصناف پر تنقید کے لیے تحقیق شرط ہے۔ تحقیق' تنقید سے ایک خاص زمانی فاصلے کا تقاضا بھی کرتی ہے۔ اس لیے مشرقی تنقید کی بنیاد تحقیق پر استوار ہوئی۔ مشرقی تنقید کے حامل بیشتر نقاد بنیادی طور پر محقق ہیں اور ان کا تنقیدی سفر اصلاً ان کی تحقیق سے شروع ہوتا ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی تنقید کی اساس تحقیق پر ہے اور ان کی تنقید میں تحقیقی انداز کارفرما نظر آتا ہے۔

ہر زبان کے ادب کا ایک مخصوص لسانی پس منظر' ایک مخصوص مزاج اور کردار بھی ہوتا ہے۔ ہماری قدیم ادبی اصناف کا تعلق مغرب سے نہیں بلکہ عربی اور فارسی کی روایت سے ہے۔ ان اصناف کے تجزیہ وتحلیل اور ان کی قدر وقیمت کے تعین کے لیے جو پیمانے استعمال کیے گئے وہ بھی قدیم مشرقی

روایت سے لیے گئے اگر موضوع تنقید، تخلیق کا تعلق قدیم ادب سے ہے تو اس کی تحقیق بھی لازم ہے بہ صورت دیگر تنقید گمراہی کا شکار ہو سکتی ہے۔ بعض ناقدین ادب کا خیال ہے کہ تنقید میں تحقیق کی کار فرمائی نے اسے نقصان پہنچایا اور تنقید کے تخلیقی شعور کو مار دیا ہے اور اس کی بڑی وجہ ادب کی نصابی تدریس ہے۔ چناں چہ شمیم احمد لکھتے ہیں:

> ''پاکستانی تدریسی اداروں میں ایسے افراد کی کثرت ہے جو مذاقِ علمی سے بہرہ ور نہیں اور نہ تنقیدی بصیرت رکھتے ہیں، جس کی وجہ سے پاکستان کے تخلیقی یا عصری ادب اور تدریسی نصاب کے درمیان طرزِ فکر، ذوقِ ادب، تنقیدی بصیرت اور تخلیقی شعور کی وسیع خلیجیں حائل ہیں۔ جو حضرات ہمارے آپ کے زمانے میں ادب کی تدریس میں تنقیدی بصیرت اور فکری راہنمائی کا فریضہ انجام دے رہے ہیں وہ ۲۵ سال قبل کے طرزِ فکر اور طرزِ احساس کو ۷۵ سال پہلے کے مسائل کی روشنی میں پیش کر رہے ہیں۔ یہ حضرات دراصل لکیر کے فقیر ہیں اور لکیر بھی وہ جس کو تنقید یا تحقیق کے کسی اصول پر صحیح ثابت نہیں کیا جا سکتا گویا اُردو کی یہ روایت ٹیڑھی لکیر کے علاوہ کچھ اور نہیں بناتی، جس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے''۔(۱۰)

یقیناً شمیم احمد کا اشارہ ان مشرقی ناقدین کی طرف ہے جو تحقیق کی روشنی میں تنقید کی تدریس کر رہے ہیں۔ ان کا استدلال اس حوالے سے تو درست ہو سکتا ہے کہ ادب کی تدریس کے ذریعے نئی نسل کو نئے ادبی مسائل اور جدید فکر سے روشناس کرایا جائے اور اسے ادبی مسائل کو نئے زاویوں سے سمجھنے کا شعور دیا جائے مگر اس حوالے سے درست نہ ہوگا کہ تنقید کو تحقیق سے جدا کر دیا جائے۔ یہاں تحقیق اور تنقید کے رشتے سے بحث مقصود نہیں۔ مختصر یہ ہے کہ اُردو تنقید میں ایسی کئی مثالیں موجود ہیں جب تحقیق سے دوری تنقید میں صحیح نتائج کے استخراج میں رکاوٹ بنی۔ شمیم احمد کا یہ اعتراض بھی درست نہیں کہ پاکستان کے تدریسی اداروں میں پڑھانے والے لوگ تنقیدی بصیرت اور مذاقِ علمی سے بہرہ

ورنہیں۔ ان کے اس اعتراض کے جواب میں محمد حسن عسکری، ڈاکٹر وحید قریشی، ممتاز حسین، سجاد باقر رضوی، نبیل احمد خان اور ڈاکٹر تحسین فراقی کا نام لینا ہی کافی ہے۔ پاکستان کے ان اہم ناقدین ادب کا تعلق درس وتدریس سے ہی رہا ہے۔

تنقید میں تحقیق کے رجحان نے تاریخی شعور کو بے دار کیا اور ہماری ادبی روایت کا رشتہ ماضی کے تہذیبی اور ادبی ورثے سے استوار کیا۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا کہ اُردو میں تجزیاتی تنقید کا رواج ہوا جس نے تنقیدی آرا کو ٹھوس بنیادیں فراہم کر کے اس کے مرتبے کو بلند کیا ہے۔ کلاسیکی ادب کے مطالعے سے مشرقی تنقید نے انفرادی اصول وضع کیے جو مغرب سے مستعار نہیں بلکہ سراسر اپنے تھے مثلاً مختصر افسانے کے فنی اصولوں کے لیے مغربی اصولوں کو ہی معیار تسلیم کیا جاتا تھا لیکن جب فورٹ ولیم کالج سے وابستہ حیدر بخش حیدری کی مختصر کہانیاں دریافت ہوئیں تو ان کو دیکھ کر افسانے کی تنقید کے لیے نئے اصول اخذ کیے گئے۔(۱۱) تنقید میں تحقیق کے رجحان نے فکری اور جمالیاتی قدار کے صحیح مطالعے کا ماحول پیدا کیا، کلاسیکی ادب کی ترتیب وتدوین سے نئی شعری اصطلاحات سامنے آئیں، شخصیات اور ان کی تحقیق سے تنقید میں فن پارے کو عمرانی اور پہلوؤں سے پرکھنے میں مدد ملی۔

مشرقی تنقید کا رخ فن پارے کی ہیئت کی طرف زیادہ رہا اور اس کی داخلی ترتیب کی نسبت ظاہری شکل وصورت زیادہ موضوع بحث رہی۔ جس کے باعث توجہ فکر سے ہٹ کر عروضی اغلاط اور لسانی مسائل تک محدود ہوگئی۔ فن پارے کے لسانی مطالعات نے بھی تنقید کو نئے زاویے بخشے ہیں مگر مشرقی تنقید میں لسانی مطالعے کا جو طریقِ کار ہے وہ جدید لسانی مطالعات سے مختلف، محض زبان و بیان کی خوبیوں خامیوں تک محدود ہے۔ اس قسم کا مطالعہ فن پارے کی روح تک پہنچنے سے قاصر رہتا ہے۔ مولوی عبدالحق مشرقی تنقید کے حق میں آواز اُٹھاتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''مشرقی کلام کی تنقید میں کیوں نہ مشرقی اصطلاحات اور معانی وبیان کے الفاظ سے کام لیں، یہ ہمارے ادب میں شروع سے مستعمل ہیں اور ان کا مفہوم متعین ہے، پڑھنے والے ان الفاظ واصطلاحات کا مفہوم بلاتامل سمجھ جاتے ہیں۔''(۱۲)

مولوی صاحب کا جواز اس قدر مضبوط نہیں جتنے کہ مشرقی تنقید کے کردار پر اٹھنے والے اعتراضات۔ اہم بات تو یہ ہے کہ پاکستان میں اُردو تنقید کے سفر کو خطِ مستقیم پر لانے میں مشرقی تنقید نے کیا کردار ادا کیا؟ مشرقی تنقید کا کردار اس حوالے سے تو مستحسن ہے کہ اس نے ماضی اور روایت سے رابطہ استوار رکھا' کلاسیکی ادب کی بازیافت کی اور قاری کا رشتہ متن سے جوڑا۔ تاہم یہ طرزِ تنقید پاکستان میں اُردو تنقید کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور اسے مغربی تنقید کے ہم رکاب بنانے میں معاون ثابت نہ ہو سکی۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی عہد کے نقاد کے لیے یہ ممکن ہوتا ہے کہ وہ تمام ادبی روایات سے ناتا توڑ کر بالکل نئی راہیں اختیار کر لے؟ ایسا تو اس وقت ممکن ہوگا جب اس کی ادبی روایت یا اس کا کوئی حصہ مکمل طور پر مفلوج ہو چکا ہو۔ شاید اُردو کی مشرقی تنقیدی روایت پوری طرح مفلوج نہیں ہوئی تھی اس لیے قیامِ پاکستان کے بعد مشرقی تنقید نے اپنے روایتی تنقید کے تسلسل کو برقرار رکھا۔

☆☆☆☆☆

## حوالہ جات


۱۔ عابد علی عابد' اصولِ انتقادِ ادبیات' لاہور: مجلس ترقی ادب' ۱۹۶۰ء ص ۱۸۷

۲۔ ڈاکٹر ابوالکلام قاسمی' مشرقی شعریات اور اُردو تنقید کی روایت' لاہور: مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی' ۲۰۰۰ء' ص ۱۳

۳۔ اسلوب احمد انصاری' اندازے' علی گڑھ: یونیورسل بک ہاؤس' ۲۰۰۸ء' ص ۴۰۵

۴۔ ڈاکٹر سلیم اختر' تنقیدی دبستان' لاہور: سنگ میل پبلی کیشنز' ۱۹۹۷ء' ص ۱۳

۵۔ ڈاکٹر وحید قریشی' دیباچہ (اُردو ادب ۱۸۵۷ء۔۱۹۶۶ء)' لاہور: مکتبہ خیابان ادب' ۱۹۹۷ء

۶۔ ڈاکٹر سید عبداللہ' اُردو ادب (۱۸۵۷ء۔۱۹۶۶ء)' لاہور: مکتبہ خیابان ادب' ۱۹۶۷ء' ص۔ب، ج

۷۔ جیلانی کامران' تنقید کا نیا پس منظر مشمولہ اُردو تنقید مرتبہ اشتیاق احمد' لاہور: القمر انٹر پرائزز ۲۰۰۹ء' ص ۱۲۶

۸۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی' اُردو تنقید کی موجودہ صورت حال مشمولہ اُردو تنقید' مرتبہ اردو تنقید' ص ۴۲۵

۹۔ ڈاکٹر جمیل جالبی' (مقدمہ) ایلیٹ کے مضامین' کراچی: مکتبہ نیا دور' ۱۹۷۱ء

۱۰۔ شمیم احمد' تنقید کی کھڑاؤں مشمولہ اُردو تنقید' مرتبہ اشتیاق احمد' ص ۴۰۹

۱۱۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی' محولہ بالا ۸' ص ۴۲۲

۱۲۔ مولوی عبدالحق' مقدمہ' اُردو تنقید کا ارتقاء (عبادت بریلوی)' کراچی' انجمن ترقی اُردو پاکستان' ۲۰۰۱ء' ص ۳۷